تقریر

تقریر بابت ایمان
وقت 5-7 منٹ

مؤمنین کا بُلند مقام و مرتبہ اَور فرائض وذمّہ داریاں

(حضرت مسیح موعودؑ کے ارشادات کے تناظر میں)

(تقریر نمبر4)

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (الانفال:3)

یعنی مؤمن صرف وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اُس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان کو ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے ربّ پر ہی توکّل کرتے ہیں۔

اُس رُخ کو دیکھنا ہی تو ہے اصل مدّعا
جنّت بھی ہے یہی کہ مل یارِ آشنا
اَے حُبِّ جاہ والو یہ رہنے کی جا نہیں
اِس میں تو پہلے لوگوں سے کوئی رہا نہیں

(درِ ثمین)

معزز سامعین! آج آپ حاضرین کے سامنے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشادات کی روشنی میں مؤمنین کا بُلند مقام و مرتبہ اَور فرائض وذمّہ داریاں بیان کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ آج کی تقریر اِس حوالے سے چوتھی کڑی ہے۔ آپ **سچا مومن کون ہے؟** کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”یقیناً یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہی مؤمن اور بیعت میں داخل ہوتا ہے جو دین کو دنیا پر مقدّم کرلے جیسا کہ وہ بیعت کرتے وقت کہتا ہے۔ اگر دنیا کی اغراض کو مقدّم کرتا ہے تو وہ اس اقرار کو توڑتا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ مجرم ٹھہرتا ہے۔ پس اسی غرض سے یہ اشتہار (الوصیت) مَیں نے خدا تعالیٰ کے اذن سے دیا ہے۔ سچی بات یہی ہے۔ سال دیگر را کہ مے داند حساب لیکن جبکہ خدا تعالیٰ کی متواتر وحی نے مجھ پر کھولا کہ وقت قریب ہے اور اجل مقدّر کا الہام ہوا تو مَیں نے اللہ تعالیٰ ہی کے اشارہ سے یہ اشتہار دیا کہ تا آئندہ کے لئے اشاعتِ دین کا سامان ہو اور تا لوگوں کو معلوم ہو کہ آمنّا و صدقنا کہنے والوں کی عملی حالت کیا ہے۔ یقیناً یاد رکھو کہ جبتک انسان کی عملی حالت درست نہ ہو زبان کچھ چیز نہیں۔ یہ نِری لاف گزاف ہے۔ زبان تک جو ایمان رہتا ہے اور دل میں داخل ہو کر اپنا اثر عملی حالت پر نہیں ڈالتا وہ منافق کا ایمان ہے۔ سچا ایمان وہی ہے جو دل میں داخل ہو اور اس کے اعمال کو اپنے اثر سے رنگین کردے۔ سچا ایمان ابوبکرؓ اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ کیونکہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال تو مال جان تک کو دے دیا اور اس کی پروا بھی نہ کی۔ جان سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہوتی مگر صحابہؓ نے اُسے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دیا۔ انہوں نے کبھی اس بات کی پروا بھی نہیں کی کہ بیوی بیوہ ہو جائے گی یا بچے یتیم رہ جائیں گے بلکہ وہ ہمیشہ اسی آرزو میں رہتے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں ہماری زندگیاں قربان ہوں۔

مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا نقش دل پر ہو جاتا ہے اور کیسی بابرکت وہ قوم تھی اور آپ کی قوتِ قدسیہ کا کیسا قوی اثر تھا کہ اس قوم کو اس مقام تک پہنچا دیا۔ غور کر کے دیکھو کہ آپ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ایک حالت اور وقت اُن پر ایسا تھا کہ تمام محرّمات ان کے لئے شِیرِ مادر کی طرح تھیں۔ چوری، شراب خوری، زنا، فسق وفجور سب کچھ تھا۔ غرض کون سا گناہ تھا جو اُن میں نہ تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت اور تربیت سے ان پر وہ اثر ہوا اور ان کی حالت میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شہادت دی اور کہا اَللّٰهُ اَللّٰهُ فِيْ اَصْحَابِيْ فِي۔ گویا بشریت کا چولہ اُتار کر مظہرُ اللہ ہو گئے تھے

اور ان کی حالت فرشتوں کی سی ہو گئی تھی جو یفعلون مایومرون کے مصداق ہیں۔ ٹھیک ایسی ہی حالت صحابہؓ کی ہو گئی تھی۔ ان کے دلی ارادے اور نفسانی جذبات بالکل دور ہو گئے تھے۔ ان کا اپنا کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ نہ کوئی خواہش تھی نہ آرزو۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو اور اس کے لئے وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔ قرآن شریف ان کی اس حالت کے متعلق فرماتا ہے مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِيۡلًا۔

یہ حالت انسان کے اندر پیدا ہو جانا آسان بات نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کو آمادہ ہو جاوے۔ مگر صحابہؓ کی حالت بتاتی ہے کہ انہوں نے اس فرض کو ادا کیا۔ جب انہیں حکم ہوا کہ اس راہ میں جان دے دو۔ پھر وہ دنیا کی طرف نہیں جھکے۔ پس یہ ضروری امر ہے کہ تم دین کو دنیا پر مقدّم کر لو۔“

(ملفوظات جلد 8 ایڈیشن 1984۔ صفحہ 296-297)

حضرت مسیح موعودؑ کے نزدیک مؤمن کون ہے۔ فرماتے ہیں:

”میرے نزدیک مؤمن وہی ہے کہ اگر اس نے خدا تعالیٰ کی راہ میں جان نہ دی ہو تو وہ رُوحانی طور پر ضرور جان دے کر شہید ہو چکا ہو۔ پس اگر موسیٰ علیہ السلام کو جان کا ہی خوف تھا۔ تو اس سے (اگر یہ افواہ سچ ہے کہ شہزادہ پیر مولوی عبد اللطیف خاں صاحب سنگسار کر کے مارے گئے ہیں) عبد اللطیف صاحب ہی اچھے رہے جنہوں نے ایمان نہ دیا اور جان دے دی۔ پس ہمارا تو یہی خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ مَیں نامُراد مارا جاؤں اور فرضِ رسالت ادا نہ ہو۔“

(ملفوظات جلد 6 ایڈیشن 1984ء صفحہ 119)

سامعین! مؤمن کی تعریف یوں بیان فرمائی:

”مؤمن کی تعریف یہ ہے کہ خیرات وصدقہ وغیرہ جو خدا نے اس پر فرض ٹھہرایا ہے بجا لاوے اور ہر ایک کارِ خیر کے کرنے میں اس کو ذاتی محبت ہو اور کسی تصنّع ونمائش وریا کو اس میں دخل نہ ہو۔ یہ حالت مؤمن کی اس کے سچے اخلاص اور تعلق کو ظاہر کرتی ہے اور ایک سچا اور مضبوط رشتہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ پیدا کر دیتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اُس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور اس کے کان ہو جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ کام کرتا ہے۔ الغرض ہر ایک فعل اُس کا اور ہر ایک حرکت سکون اس کا اللہ ہی کا ہوتا ہے۔ اس وقت جو اس سے دشمنی کرتا ہے اور پھر فرماتا ہے کہ مَیں کسی بات میں اس قدر تردّد نہیں کرتا جس قدر کہ اس کی موت میں قرآن شریف میں لکھا ہے کہ مؤمن اور غیر مؤمن میں ہمیشہ فرق رکھ دیا جاتا ہے۔ غلام کو چاہیے کہ ہر وقت رضاِ الٰہی کو ماننے اور ہر ایک رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں دریغ نہ کرے۔ کون ہے جو عبودیت سے انکار کر کے خدا کو اپنا محکوم بنانا چاہتا ہے؟“

(ملفوظات جلد 6 ایڈیشن 1984ء صفحہ 17-18)

مؤمن وہ ہے جس کا نام آسمان پر تحریر ہو۔ فرماتے ہیں:

”بہت سی مخلوق ایسی ہے کہ لوگ ان کو مؤمن اور راست باز سمجھتے ہیں مگر آسمان پر اُن کا نام کافر ہے۔ اس واسطے حقیقی مؤمن اور راستباز وہی ہے جس کا نام آسمان پر مؤمن ہے۔ دنیا کی نظر میں خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ کہلاتا ہو۔ حقیقت میں یہ بہت ہی مشکل گھاٹی ہے۔ کہ انسان سچا ایمان لاوے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ کامل اخلاص اور وفاداری کا نمونہ دکھلاوے۔ جب انسان سچا ایمان لاتا ہے تو اس کے بہت سے نشانات ہو جاتے ہیں۔ قرآن شریف نے سچے مؤمنوں کی جو علامات بیان کی ہیں وہ ان میں پائی جاتی ہیں۔ ان علامات میں سے ایک بڑی علامت جو حقیقی ایمان کی ہے وہ یہی ہے کہ جب انسان دنیا کو پاؤں کے نیچے کچل کر اُس سے اس طرح الگ ہو جاتا ہے جیسے سانپ اپنی کینچلی سے باہر آ جاتا ہے۔ اس طرح پر جب انسان نفسانیت کی کینچلی سے باہر آ جاتا ہے تو وہ مؤمن ہوتا ہے اور ایمانِ کامل کے آثار اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ۔ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور جو تقویٰ سے بھی بڑھ کر کام کرتے ہیں یعنی محسنین ہوتے ہیں۔“

(ملفوظات جلد 6 ایڈیشن 1984ء صفحہ 240-241)

مؤمن ہونے کے لئے دل سے ایمان لانا ضروری ہے۔ فرمایا:

”بعض لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے سوا اَوروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں اگر فلاں نہ ہوتا تو مَیں ہلاک ہو جاتا۔ میرے ساتھ فلاں نے احسان کیا۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ۔ مَیں اس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جس کی تمام پرورشیں ہیں۔ ربّ یعنی پرورش کنندہ وہی ہے اس کے سوا کسی کا رحم اور کسی کی پرورش نہیں ہوتی حتیٰ کہ جو ماں باپ بچے پر رحمت کرتے ہیں۔ دراصل وہ بھی اسی خدا کی پرورشیں ہیں اور بادشاہ جو رعایا سے انصاف کرتا ہے اور اُس کی پرورش کرتا ہے۔ وہ سب بھی اصل میں خدا تعالیٰ کی مہربانی ہے۔

ان تمام باتوں سے اللہ تعالیٰ یہ سکھلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی نہیں۔ سب کی پرورشیں اسی کی پرورشیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ بادشاہوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں نہ ہوتا تو مَیں تباہ ہوجاتا اور میر افلاں کام بادشاہ نے کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ یادرکھو! ایسا کہنے والے کافر ہوتے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ کافر نہ بنے، مؤمن بنے اور مؤمن نہیں ہوتا جب تک کہ دل سے ایمان نہ رکھے کہ سب پرورشیں اور رحمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ انسان کو اس کا دوست ذرّہ بھی فائدہ نہیں دے سکتا جب تک کہ خدا تعالیٰ کا رحم نہ ہو۔ اسی طرح بچے اور تمام رشتہ داروں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رحم ہونا ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دراصل مَیں ہی تمہاری پرورش کرتا ہوں۔ جب تک خدا تعالیٰ کی پرورش نہ ہو تو کوئی پرورش نہیں کر سکتا۔ دیکھو! جب خدا تعالیٰ کسی کو بیمار ڈال دیتا ہے تو بعض دفعہ طبیب کتنا ہی زور لگاتے ہیں مگر وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔ طاعون کے مرض کی طرف غور کرو۔ سب ڈاکٹر زور لگا چکے۔ مگر یہ مرض دفع نہ ہوا۔ اصل یہ ہے کہ سب بھلائیاں اسی کی طرف سے ہیں اور وہی ہے کہ جو تمام بدیوں کو دُور کرتا ہے۔"

(ملفوظات جلد 6 ایڈیشن 1984ء صفحہ 24-25)

سامعین! مؤمن کا متولّی اور متکفّل اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ فرمایا:

" مؤمن وہ ہوتا ہے جو ایمان پر قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا متولّی اور متکفّل ہوتا ہے۔ اسلام میں کروڑہا ایسے آدمی گزرے ہیں جنہوں نے نہ سود لیا نہ دیا۔ آخر ان کے حوائج بھی پورے ہوتے رہے کہ نہیں؟ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ لو نہ دو جو ایسا کرتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ کے ساتھ لڑائی کی تیاری کرتا ہے ایمان ہو تو اس کا صلہ خدا بخشتا ہے۔ ایمان بڑی بابرکت شئے ہے۔ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (البقرہ:107) اگر اُسے خیال ہو کہ پھر کیا کرے؟ تو کیا خدا کا حکم بھی بیکار ہے؟ اُس کی قدرت بہت بڑی ہے۔ سود تو کوئی شئے ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا کہ زمین کا پانی نہ پیا کرو تو وہ ہمیشہ بارش کا پانی آسمان سے دیا کرتا۔ اسی طرح ضرورت پر وہ خود ایسی راہ نکال ہی دیتا ہے کہ جس سے اُس کی نافرمانی بھی نہ ہو۔ جب تک ایمان میں میل کچیل ہوتا ہے تب تک یہ ضعف اور کمزوری ہے۔ کوئی گناہ چھوٹ نہیں سکتا جب تک خدا نہ چھڑا دے ورنہ انسان تو ہر ایک گناہ پر یہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ ہم چھوڑ نہیں سکتے اگر چھوڑیں تو گزارہ نہیں چلتا۔ دکانداروں عطاروں کو دیکھا جاوے کہ پُرانا مال سالہا سال تک بیچتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ ملازم پیشہ لوگ رشوت خوری کرتے ہیں اور سب یہ عذر کرتے ہیں کہ گزارہ نہیں چلتا۔ ان سب کو اگر اکٹھا کر کے نتیجہ نکالا جاوے تو پھر یہ نکلتا ہے کہ خدا کی کتاب پر عمل ہی نہ کرو کیونکہ گزارہ نہیں چلتا حالانکہ مؤمن کے لئے خدا خود سہولت کر دیتا ہے۔ یہ تمام راستبازوں کا مجرّب علاج ہے کہ مصیبت اور صعوبت میں خدا خود راہ نکال دیتا ہے۔

لوگ خدا کی قدر نہیں کرتے۔ جیسے بھروسہ اُن کو حرام کے دروازہ پر ہے ویسا خدا پر نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ پر ایمان یہ ایک نسخہ ہے کہ اگر قدر ہو تو جی چاہے کہ جیسے اور عجیب نسخہ مخفی رکھنا چاہتے ہیں ویسے ہی اُسے بھی مخفی رکھا جاوے۔ مَیں نے کئی دفعہ بیماریوں میں آزمایا ہے کہ پیشاب بار بار آرہا ہے۔ دست بھی لگے ہیں۔ آخر خدا سے دعا کی۔ صبح کو الہام ہوا

دُعَاءُكَ مُسۡتَجَاب

اس کے بعد ہی وہ کثرت جاتی رہی اور کمزوری کی جگہ طاقت آگئی۔ یہ خدا کی طاقت ہے۔ خدا ایسا عجیب ہے کہ ان نسخوں سے بھی زیادہ قابل قدر ہے جو کیمیا وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ مجھے بھی ایک دفعہ خیال آیا کہ یہ تو چھپانے کے قابل ہے پھر سوچا کہ یہ تو بخل ہے۔ ایسی مفید شئے کا دنیا پر اظہار کرنا چاہئے کہ مخلوق الٰہی کو فائدہ حاصل ہو۔ یہی فرق اسلام اور دوسرے مذاہب کے خدا میں ہے۔ اُن کا خدا بولتا نہیں۔ خدا معلوم یہ بھی کیسا ایمان ہے؟۔ اسلام کا خدا جیسا پہلے تھا ویسے ہی اب ہے۔ نہ طاقت کم ہوئی نہ بوڑھا ہوا۔ نہ کچھ اَور نقص اُس میں واقع ہوا۔ ایسے خدا پر جس کا ایمان ہو وہ اگر آگ میں بھی پڑا ہو تو اُسے حوصلہ ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو آخر آگ میں ڈالا ہی تھا۔ ایسے ہی ہم بھی آگ میں ڈالے گئے خون کا مقدمہ بنایا گیا۔ اگر اس میں چھ یا دس سال کی قید ہوجاتی تو سب سلسلہ تباہ ہوجاتا سب قوموں نے متفق ہو کر یہ آگ سلگائی تھی۔ کیا کم آگ تھی؟ اس وقت سوائے خدا کے اَور کون تھا؟ اور وہی الہام ہوئے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہوئے تھے۔ آخر میں الہام ہوا

اِبۡرَاءٌ

اور تسلّی دی کہ سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے۔"

(ملفوظات جلد 5 ایڈیشن 1984ء صفحہ 219-221)

مؤمن کے تین مدارج حضور علیہ السلام نے یوں بیان فرمائے ہیں:

” مؤمن کی جو تقسیم قرآنِ شریف میں کی گئی ہے۔ اس کے تین ہی درجے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں۔ ظالم۔ مُقتصِد ۔ سابق بالخیرات۔ یہ ان کے مدارج ہیں۔ ورنہ اسلام کے اندر یہ داخل ہیں۔ ظالم وہ ہوتا ہے کہ ابھی اس میں بہت غلطیاں اور کمزوریاں ہیں اور مُقتصِد وہ ہوتا ہے کہ نفس اور شیطان سے اس کی جنگ ہوتی ہے۔ مگر کبھی یہ غالب آجاتا ہے اور کبھی مغلوب ہوتا ہے۔ کچھ غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور صلاحیت بھی اور سابق بالخیرات وہ ہوتا ہے۔ جو ان دونوں درجوں سے نکل کر مستقل طور پر نیکیاں کرنے میں سبقت لے جاوے اور بالکل صلاحیت ہی ہو۔ نفس اور شیطان کو مغلوب کر چکا ہو۔ قرآن شریف ان سب کو مسلمان ہی کہتا ہے۔“

(ملفوظات جلد4صفحہ 125)

پھر مؤمن کی مثالیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

” اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو اس میں دو قسم کی عورتوں سے مثال دی ہے۔ اوّل فرعون کی بیوی سے اور ایک مریم سے۔ پہلی مثال میں یہ بتایا ہے کہ ایک مؤمن اس قسم کے ہوتے ہیں جو ابھی اپنے جذباتِ نفس کے پنجے میں گرفتار ہوتے ہیں اور اُن کی بڑی آرزو اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کو اس سے نجات دے۔ یہ مؤمن فرعون کی بیوی کی طرح ہوتے ہیں کہ وہ بھی فرعون سے نجات چاہتی تھی مگر مجبور تھی لیکن جو مؤمن اپنے تئیں تقویٰ اور طہارت کے بڑے درجہ تک پہنچاتے ہیں اور احصان فرج کرتے ہیں تو پھر خدا تعالیٰ ان میں عیسیٰ کی روح نفخ کو دیتا ہے۔ نیکی کے یہ دو مرتبے ہیں جو مؤمن حاصل کر سکتا ہے مگر دوسرا بہت بڑھ کر ہے کہ اُس میں نفخِ رُوح ہو کر وہ عیسیٰ بن جاتا ہے۔ یہ آیت صاف اشارہ کرتی ہے کہ اِس اُمّت میں کوئی شخص مریم صفت ہو گا کہ اُس میں نفخ ہو کر عیسیٰ بنادیا جائے گا۔ اب کوئی عورت تو ایسی ہے نہیں اور نہ کسی عورت کے متعلق پیشگوئی ہے۔ اِس لیے صاف ظاہر ہے کہ اِس سے یہی مراد ہے کہ اِس اُمّت میں ایک ایسا انسان ہو گا جو پہلے اپنے تقویٰ و طہارت اور احصان اور عفّت کے لحاظ سے صفت مریمیت سے موصوف ہو گا اور پھر اُس میں نفخ ہو کر صفات عیسوی پیدا ہوں گی۔ اب اُس کی کیفیت اور لطافت براہین احمدیہ سے معلوم ہو گی کہ پہلے میرا نام مریم رکھا۔ پھر اُس میں روح صدق نفخ کر کے مجھے عیسیٰ بنایا۔ مؤمنوں کی جو یہ دو مثالیں بیان کی ہیں وہ اس آیت (فاطر:33) سے بھی معلوم ہوتی ہیں۔

مریم صفات والے کے لئے ضرور ہے کہ وہ عیسویت کے رنگ میں تبدیل ہو جاوے۔ اگر اس آیت میں صرف مریم کا لفظ ہوتا تو بہت سے افراد ہو سکتے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ نے احصان فرج اور نفخ روح کی قید لگا کر بتا دیا ہے کہ ایک ہی شخص ہو گا۔ یہ ایک استعارہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اِس کے لئے یہی وقت مقدّر تھا۔ پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ مریم، نفخ روح اور میرا نام عیسیٰ رکھنے کے الہاموں میں صرف 9 یا 10 ماہ کا فاصلہ ہے جو کہ مدّت حمل ہے۔ ان تمام ترقیات کا سلسلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو کیا خبر ہے کہ کس طرح ایک بیج زمین کے اندر کیا کیا بن کر آخر کار ایک پیڑ بن جاتا ہے۔“

(ملفوظات جلد4صفحہ 385-386)

پھر فرمایا:

” اُمّت کی دو ہی قسم ہیں۔ ایک فرعون کی بیوی اور دوسرے مریم بنت عمران اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ (فاطر:33) ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہ نفس امّارہ کے تابع ہیں کہ جس راہ پر نفس نے ڈالا۔ اُسی راہ پر چل پڑے اور وہ صُمٌّ بُکۡمٌ کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی مثال بہائم کی ہے۔ اِس لئے کسی مد میں نہیں آسکتے اور یہ کثرت سے ہوتے ہیں۔ پھر اُس کے بعد نفس لوّامہ والے جو کہ فرعون کی بیوی (کی طرح) ہیں۔ یعنی اُن کو نفس ہمیشہ ملامت کرتا رہتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ امّارہ سے ان کو آزادی ملے یہ کم ہوتے ہیں اور پھر اُن میں سے کم نفسِ مطمئنہ والے یعنی مریم بنت عمران جس زمانے کا وعدہ خدا نے کیا ہوا تھا۔ ضرور تھا کہ اس میں ایک نفس مریم کی طرح ہوتا اور اس زمانے میں خدا نے قید ضمیر مذکّر استعمال کی ہے تاکہ اشارہ اس طرف ہو کہ ایک مرد ہو گا جو کہ صفات مریمیت حاصل کر کے عیسیٰ ہو گا۔“

(ملفوظات جلد4حاشیہ صفحہ 386-387)

سامعین! اَلدُّنۡیَا سِجۡنٌ لِلۡمُؤۡمِنِ۔ فرمایا

”بعض لوگ وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ کی آیت کے معارض ایک حدیث پیش کیا کرتے ہیں اَلدُّنۡیَا سِجۡنٌ لِلۡمُؤۡمِنِ اس کے اصل معنے یہ ہیں کہ مؤمن کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِنَفۡسِهٖ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌ بِالۡخَيۡرَات۔ مُقتصد سے مراد نفس لوّامہ والے ہیں اور یہ دنیا کی تکالیف نفس لوّامہ تک ہی ہوتی ہیں کہ اُس میں انسان کے ساتھ کشاکش نفس امّارہ کی ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ راحت اور آرام کی یہ بات اختیار کر اور لوّامہ وہ نہیں کرتا۔ اُس وقت انسان مجاہدہ کرتا ہے اور

نفس امّارہ کو زیر کرتا ہے اور اسی طرح جنگ ہوتی رہتی ہے۔ حتّٰی کہ امّارہ شکست کھا جاتا ہے اور پھر نفس مطمئنہ رہ جاتا ہے۔ یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ۔ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً (الفجر:28-29) یعنی تو میری جنت میں داخل ہو جا اور اسی وقت ہو جا اور مؤمن کی جنت خود خدا ہے یعنی جب وہ خدا کے بندوں میں داخل ہوا۔ تو خدا تو انہیں میں ہے اور وہ اُس کے عباد میں آ گیا تو اب اِس حالت میں وہ سِجّن کہاں رہا؟ ایک مرتبہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ تکالیف میں ہوتا ہے جیسے جب کنواں کھودا جائے تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ پانی نکل آئے۔ مطمئنہ ہونا اصل پانی نکالنا ہے۔ جب پانی نکل آیا اب کھودنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس آیت میں ظالم سے مراد نفس امّارہ والے اور مُقتصد سے مراد نفسِ لوّامہ والے اور سابق بالخیرات سے مراد نفسِ مطمئنہ والے ہیں۔ پوری تبدیلی زندگی میں جب تک نہ آوے تب تک جنگ رہتی ہے اور لوّامہ تک یہ جنگ ہے۔ جب یہ ختم ہوئی تو پھر دار النعیم میں آ جاتا ہے۔ اُس وقت اُس کا ارادہ خدا کا ارادہ اور اُس کی مرضی خدا کی مرضی ہوتی ہے اور وہ اُن باتوں میں لذّت اُٹھاتا ہے جن سے خدا خوش ہوتا ہے۔ ایک عارف جس کی خدا سے ذاتی محبت ہو جائے تو اگر خدا اُسے بتلا بھی دے کہ تو دوزخی ہے خواہ عبادت کر خواہ نہ کر تو اُس کی خوشی اسی میں ہو گی کہ خواہ دوزخ میں جاؤں مگر مَیں ان عبادات سے رک نہیں سکتا۔ جیسے افیونی کو جب افیون کی عادت ہو جاتی ہے تو اُسے کیسی ہی تکالیف ہوں اور خواہ وہ گھلتا ہی جائے مگر افیون کو نہیں چھوڑتا۔ جس طرح دنیا میں نوجوانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کو ایک دُھن جب لگ جائے تو خواہ والدین کتنا روکیں، منع کریں مگر وہ کسی کی نہیں سنتے اور اُس دُھن کی خوشی میں تکالیف کا بھی خیال نہیں ہوتا۔ ایسا ہی اُس مؤمن عارف کامل کا حال ہوتا ہے کہ اُسے اِس بات کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ اجر ملے گا یا نہیں۔ یہ مقام آخری مقام ہے جہاں سلوک کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور اس کے سوا چارہ نہیں۔ اِس حالت میں اس کا جوش کسی سہارے پر نہیں ہوتا کیونکہ جبتک انسان کسی سہارے سے کام کرتا ہے تو ممکن ہے شیطان اُس میں کسی وقت دخل دیوے۔ مگر یہاں ذاتی محبت کے مقام میں سہارا نہیں ہوتا۔ جیسے ماں اور بچے کے جو تعلقات ذاتی محبت کے ہیں اُن میں انسان تفرقہ نہیں ڈال سکتا۔

ماں کی فطرتی محبت ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ مثل مشہور ہے ماں مارے اور بچہ ماں ماں پکارے۔ اسی طرح اہل اللہ خدا کی مار کھا کر کہاں جا سکتے ہیں۔ بلکہ مار پڑے تو وہ ایک قدم اور بڑھاتے ہیں۔ دوسرے تعلقات میں خدا کی محبت کا جلال زور کے ساتھ نازل نہیں ہوتا۔ جیسے انسان کسی کو اپنا نوکر سمجھتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ یہ نوکری اسی لئے کرتا ہے کہ اس کی اُجرت ملے تو اس کی طرف محبّتِ کامل کا التفات نہیں ہوتا اور وہ ایک نوکر شمار ہوتا ہے مگر جب کوئی شخص خدمت کرتا ہے اور آقا کو معلوم ہو کہ یہ نوکری کی خواہش سے نہیں کرتا تو آخر کار بیٹوں میں شمار ہوتا ہے۔"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 253-255)

مؤمن اور موت کے حوالہ سے فرمایا:

"خالی زبان تک ایمان کا ہونا کوئی فائدہ نہیں دیتا جیسے صحابہ نے صدق دکھلایا کہ ہتھیلی پر جانیں رکھ لیں اور بال بچوں تک کو قربان کیا۔ مگر ہم آج ایک شخص کو اگر کہیں کہ سو کوس چلا جا تو وہ عذر کرتا ہے حتّٰی کہ آبرو و عزّت کا معاملہ پیش کرتا ہے اور کاروبار کا ذکر کرتا ہے کہ کسی طرح جانے سے رہ جائے مگر انہوں (صحابہ) نے جان- مال- آبرو- عزت سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر فلاں فلاں آفت آئی۔ حالانکہ ہم نے بیعت کی تھی مگر ہم نے بار بار جماعت کو کہا ہے کہ نِری بیعت اور صرف زبان سے ماننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ چاہیے کہ خدا میں گداز ہو کر ایک نیا وجود بن جائے۔ سارا قرآن دیکھو کہ کہیں بھی صرف اٰمَنُوۡا نہیں لکھا ہے۔ ہر جگہ عمل صالح کا ساتھ ہی ذکر ہے۔ غرضیکہ خدا ایک موت چاہتا ہے اور میرا تجربہ ہے کہ خدا مؤمن پر دو موتیں ہر گز جمع نہیں کرتا کہ ایک موت تو اس کی خدا کے واسطے ہو اور دوسری دنیا کی لعن طعن کے واسطے۔ ایسے نازک وقت میں چاہیے کہ جماعت سمجھ جائے اور ایک تیر کی طرح سیدھی ہو جائے۔ اگر ہزاروں آدمی بھی طاعون سے مر جائیں تو مَیں ہر گز خدا کو ملزم نہ کروں گا اور یہی کہوں گا کہ انہوں نے احسان کا پہلو چھوڑ دیا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (التوبہ:120)"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 281)

مؤمن اور دُنیوی زندگی پر فرمایا۔

"مؤمن کو اِس زندگی پر ہر گز مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ اتنی بلائیں اِس زندگی میں ہیں کہ شمار نہیں۔ ایک بیماری ہوتی ہے کہ انسان کے پاخانہ کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور مُنہ کے راستہ پاخانہ آتا ہے اور اس کا نام ایلاؤس ہے اور پھر اسی طرح گردہ اور مثانہ کی بیماریاں ہیں کہ رنگا رنگ کے سُرخ، سبز اور سیاہ پتھر بن جاتے ہیں اور اُن کا کوئی خاص سبب بھی کیا بیان ہو سکتا ہے بلکہ امراء لوگ جو کہ عمدہ غذا اور نفیس پانی استعمال کرتے ہیں انہیں کو ایسی امراض ہوتی ہیں۔ اگر دو شخص ایک ہی جگہ رہتے ہوں۔ ایک ہی قسم کی ان کی خورد و نوش ہو پھر ایک اُن میں سے ایسے عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے دوسرا نہیں ہوتا۔ اس لئے طب کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ظنّی علم ہے۔ عللِ مادیہ میں یہ

لوگ اسباب کی تحقیق کرتے ہیں مگر اس کا بھی سبب بتلاویں کہ جب الہام ہونے لگتا ہے یا کشف تو اس وقت نیند سی آنے لگتی ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ ان لوگوں کا دستور ہے کہ جب ان کو ایک بات کا سبب معلوم نہ ہو تو اس سے انکار کر بیٹھتے ہیں اور اسی لئے وحی اور الہام کے منکر ہیں۔"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 376)

مؤمن کے تین طبقے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

" مؤمنوں کے تین طبقے ہیں:

ایک وہ جو ٹھوکر کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو میانہ روی کسی ٹھوکر سے بچتے اور ڈرتے رہتے ہیں۔ تیسرے وہ جو ہر ایک ٹھوکر سے ایسے بچ کر نکل جاتے ہیں جیسے سانپ اپنی کینچلی سے۔ وہ ہر ایک خیر کے لئے دوڑتے اور ہر ایک شرّ سے بھاگتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے تزکیہ کا خیال نہیں کیا وہ بالضرور بے پردگی سے ٹھوکر کھاسکتے ہیں۔ عورتوں کو اُن سے پردہ کرنا چاہئے۔ مثل مشہور ہے

خربستہ بہ گرچہ دزد آشنا است

قسم اوّل ظالم لنفسھم - دوئم مقتصد۔ سوم سابق بالخیرات

ان مختلف مدارج و مراتب کے اشخاص کیسے یکساں سلوک کے لائق ہیں؟ کیا عیسائی بتاسکتے ہیں کہ اُن میں سب پاکباز ہیں۔ شرابی نہیں۔ زانی نہیں۔ اگر پردہ ہوتا تو اِن جرائم کی نوبت کیوں آتی ہزار ہا ولد الحرام کیوں پیدا ہوتے۔ تجربہ بتا رہا ہے کہ اوّل قسم کے لوگ بکثرت ہیں۔ اس لئے ان سے حتّٰی الوسع پردہ کرنے کے لئے شریعت نے مجبور کیا کہ پردہ کی رسم ہو۔ شرابی آدمی کو نہ طعن و تشنیع کا فکر ہے نہ ڈنڈے کا خوف۔ اس لئے عیسائیوں کا اسلام پذیر ہونا حالات سے ہے۔"

(ملفوظات جلد 5 صفحہ 452-453)

المؤمن اور الناس میں فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

" ثبوت اس قسم کے دیئے ہیں کہ اللہ اکبر! یہانتک کہ مشہودات اور محسوسات سے ایمان کی تقویت ہوتی ہے لیکن جو لوگ ایمانی فراست سے حصّہ رکھتے ہیں وہ پہلے ہی سمجھ لیتے ہیں جو لوگ حق قبول کرتے ہیں وہ اُسی وقت فراست والے کہلاتے ہیں جب وہ اوّل ہی اوّل قبول کرتے ہیں خدا جو مؤمنوں کی تعریف کرتا ہے اور رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کہتا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی فراست سے پہلے رسول اللہ کو مان لیا۔ لیکن جب کثرت سے لوگ داخل ہونے لگے اور انکشاف ہوگیا۔ اُس وقت داخل ہونے والے کا نام الناس رکھا۔ اس حالت میں تو گویا منع کرتا ہے یہ کہہ کر قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (الحجرات:15) یعنی یہ مت کہو کہ ہم ایمان لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کی۔ ایمان اُس وقت ہوتا ہے جب ابتلاء کے موقع آویں جن پر ایمان لانے کے بعد ابتلاء کے موقع نہیں آئے وہ اَسْلَمْنَا میں داخل ہیں۔ انہوں نے تکلیف کا نشانہ ہو کر نہیں دیکھا بلکہ وہ اقبال اور نصرت کے زمانہ میں داخل ہوئے یہی وجہ ہے کہ فخر کا نام اور خطاب ان کو نہ ملا۔ بلکہ الناس ان کا نام رکھا کیونکہ وہ ایسے وقت داخل ہوئے جب کام چل پڑا اور رسول اللہ نے اپنی صداقت کی روشنی دکھلائی۔ اس وقت دوسرے مذاہب حقیر نظر آئے تو سب داخل ہوگئے۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 398)

سامعین! کافر اور مؤمن کی رؤیا میں فرق بیان کرتے ہوئے آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے وحی اور الہام کا مادہ ہر شخص میں رکھ دیا ہے کیونکہ اگر یہ مادہ نہ رکھا ہوتا تو پھر صحت پوری نہ ہوسکتی۔ اِس لئے جو نبی آتا ہے اس کی نبوت اور وحی والہام کے سمجھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی فطرت میں ایک ودیعت رکھی ہوئی ہے اور وہ ودیعت خواب ہے۔ اگر کسی کو کوئی خواب بھی کبھی نہ آئی ہو تو وہ کیونکر مان سکتا ہے کہ الہام اور وحی بھی کوئی چیز ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ اس لئے یہ مادہ اُس نے سب میں رکھ دیا ہے۔ میرا یہ مذہب ہے کہ ایک بدکار اور فاسق فاجر کو بھی بعض وقت سچی رؤیا آجاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی الہام بھی ہوجاتا ہے گو وہ شخص اس کیفیت سے کوئی فائدہ اٹھاوے یا نہ اُٹھاوے۔ جبکہ کافر اور مؤمن دونوں کو سچی رؤیا آجاتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ عظیم الشان فرق تو یہ ہے کہ کافر کی رؤیا بہت ہی کم سچی نکلتی ہے اور مؤمن کی کثرت سے سچی نکلتی ہے۔ گویا پہلا فرق کثرت اور قلّت کا ہے۔ دوسرے مؤمن کے لئے بشارت کا حصہ زیادہ ہے جو کافر کی رؤیا میں نہیں ہوتا۔ سوم مؤمن کی رؤیا مصفّا اور روشن ہوتی ہے بحالیکہ کافر کی رؤیا مصفّا نہیں ہوتی۔ چہارم مومن کی رؤیا اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 369)

قرآن میں مؤمن کی نشانی کا ذکر کرتے ہوئے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:

” سو یہ ایک نعمت ہے کہ ولیوں کو خدا کے فرشتے نظر آتے ہیں۔ آئندہ کی زندگی محض ایمانی ہے۔ لیکن ایک متقی کو آئندہ کی زندگی یہیں دکھلائی جاتی ہے۔ انہیں اسی زندگی میں خدا ملتا ہے، نظر آتا ہے اور اُن سے باتیں کرتا ہے۔ سو اگر ایسی صورت کسی کو نصیب نہیں تو اُس کا مرنا اور یہاں سے پہلے جانا نہایت خراب ہے۔ ایک ولی کا قول ہے کہ جس کو ایک خواب سچا عمر میں نصیب نہیں ہوا۔ اُس کا خاتمہ خطرناک ہے جیسے کہ قرآن مؤمن کے یہ نشان ٹھہراتا ہے۔ سنو! جس میں یہ نشان نہیں اُس میں تقویٰ نہیں۔ سو ہم سب کی یہ دعا چاہیے کہ یہ شرط ہم میں پوری ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام، خواب، مکاشفات کا فیضان ہو۔ کیونکہ مؤمن کا یہ خاصّہ ہے سو یہ ہونا چاہیے۔

بہت سی اَور بھی برکات ہیں جو متقی کو ملتی ہیں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ میں جو قرآن کے شروع میں ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤمن کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ دُعا مانگیں۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ یعنی ہمیں وہ راہ سیدھی بتلا اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام وفضل ہے۔ یہ اِس لئے سکھلائی گئی ہے کہ انسان عالی ہمت ہو کر اُس سے خالق کا منشاء سمجھے اور وہ یہ ہے کہ یہ اُمّت بہائم کی طرح زندگی بسر نہ کرے۔ بلکہ اس کے تمام پردے کھل جاویں۔ جیسے کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ولایت بارہ اماموں کے بعد ختم ہو گئی۔ برخلاف اِس کے اِس دعا سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے سے ارادہ کر رکھا ہے کہ جو متقی ہو اور خدا کی منشاء کے مطابق ہے تو وہ اُن مراتب کو حاصل کر سکے جو انبیاء اور اصفیاء کو حاصل ہوتے ہیں۔ اِس سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انسان کو بہت سے قویٰ ملے ہیں جنہوں نے نشو و نما پانا ہے اور بہت ترقی کرنا ہے۔ ہاں ایک بکرا چونکہ انسان نہیں، اس کے قویٰ ترقی نہیں کر سکتے۔ عالی ہمت انسان جب رسولوں اور انبیاء کے حالات سنتا ہے تو چاہتا ہے کہ وہ انعامات جو اس پاک جماعت کو حاصل ہوئے اُس پر نہ صرف ایمان ہی ہو بلکہ اسے بہ تدریج ان نعماء کا علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہو جاوے۔“

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ 18-19)

مؤمن خلق اور خالق کے نزدیک اہلِ کرامت ہو جائے۔ فرمایا:

” مَیں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک شخص جو اپنے اخلاقِ سیئہ کو چھوڑ کر عاداتِ ذمیمہ کو ترک کر کے خصائل حسنہ کو لیتا ہے اُس کے لئے وہی کرامت ہے۔ مثلاً اگر بہت ہی سخت تُند مزاج اور غصّہ ور اِن عاداتِ بد کو چھوڑتا ہے اور حلم اور عفو کو اختیار کرتا ہے یا امساک کو چھوڑ کر سخاوت اور حسد کی بجائے ہمدردی حاصل کرتا ہے تو بیشک یہ کرامت ہے اور ایسا ہی خودستائی اور خود پسندی کو چھوڑ کر جب انکساری اور فروتنی اختیار کرتا ہے تو یہ فروتنی ہی کرامت ہے۔ پس تم میں سے کون ہے جو نہیں چاہتا کہ کراماتی بن جاوے۔ مَیں جانتا ہوں ہر ایک یہی چاہتا ہے۔ تو بس یہ ایک مدامی اور زندہ کرامت ہے۔ انسان اخلاقی حالت کو درست کرے کیونکہ یہ ایسی کرامت ہے جس کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا بلکہ نفع دور تک پہنچتا ہے۔ مؤمن کو چاہیے کہ خَلق اور خالق کے نزدیک اہل کرامت ہو جاوے بہت سے رِند اور عیاش ایسے دیکھے گئے ہیں جو کسی خارق عادت نشان کے قائل نہیں ہوئے لیکن اخلاقی حالت کو دیکھ کر انہوں نے بھی سر جھکالیا ہے اور بجز اقرار اور قائل ہونے کے دوسری راہ نہیں ملی۔ بہت سے لوگوں کے سوانح میں اِس امر کو پاؤ گے کہ انہوں نے اخلاقی کرامات ہی کو دیکھ کر دینِ حق کو قبول کر لیا۔“

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ 141-142)

اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقی مومن بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(کمپوزڈ: مسز عائشہ چوہدری۔ جرمنی)

✡✡✡✡